مقدمہ

بیتال پچیسی کے مترجم نے ابتدائے داستان میں اس کتاب پر تین آدمیوں کے کام کا اعتراف کیا ہے -

(۱) مظہر علی ولا : جنہوں نے اس کتاب کو برج بھاشا سے زبان سہل (یعنی اردو) میں منتقل کیا -

(۲) شری للوجی لال کوی : جنہوں نے ترجمے کے دوران میں مظہر علی ولا کی معاونت کی -

(۳) تارنی چرن متر : جنہوں نے چھاپے کے واسطے سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ کو جو ریختے کے محاورے میں کم آئے تھے ، نکال کر مروج الفاظ کو داخل کیا -

ذیل میں ان تینوں حضرات کے مختصر سوانح حیات پیش کیے جاتے ہیں -

مظہر علی ولا

مظہر علی خاں نام اور ولا تخلص تھا - مصحفی نے ان کا عرف لطف علی اور قدرت‌اللہ قاسم نے لطف‌اللہ لکھا ہے - لیکن بینی نرائن جہاں ، سید محمد ، حامد حسن قادری ، اور محمد یحییٰ تنہا نے ان کا نام مرزا لطف علی اور عرف مظہر علی خاں بیان کیا ہے - جس طرح نام میں اختلاف ہے - اسی

طرح تخلص میں بھی تذکرہ نگاروں کے درمیان مختلف رائیں موجود ھیں - چنانچہ مصحفی کے ھاں باطن اور مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ھاں ان کا تخلص والہ بھی ملتا ھے - باپ کا نام سلیمان قلی خاں وداد ، دادا کا نام آقا محمد حسین اصفہانی اور پردادا کا نام آقا صادق ترک تھا - یہ شجرہ ولا نے جہانگیر شاھی میں درج کیا ھے[1] - خود ولا کے بیان کے مطابق ان کے دادا ، اپنے والد کے ھمراہ اصفہان سے شاھجہان آباد میں آئے اور ان کے دادا نواب سعیدالدین خان بہادر میر آتش کی وساطت سے سنۂ احد میں محمد شاہ بادشاہ کے ملازم ھوئے -[2] ولا کے دادا آقا محمد حسین کو محمد شاہ کی طرف سے علی قلی خاں کا خطاب ملا اور بائیس خدمتوں سے سرفراز ھوئے - علی قلی خاں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سلیمان قلی خاں عرف مرزا محمد زمان وداد (ولا کے والد) نواب نجم‌الدولہ اسحاق خاں بہادر کے وسیلے سے منگ باشی کے عہدے پر فائز ھوئے - (یہ وھی نجم‌الدولہ اسحاق خاں ھیں جن کے یہاں میر تقی میر بھی کچھ عرصہ ملازم رھے - ان کا تذکرہ میر نے ”ذکر میر“ میں کیا ھے) مرزا محمد زمان وداد نے شاہ عالم (تخت نشینی جمادی‌الاول ۱۱۷۳ھ ، وفات ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ) کے ابتدائے سلطنت میں عزت الدولہ صولت جنگ، موسیٰ خان بہادر کی رفاقت اختیار کی - وداد فارسی کے شاعر

۱- جہانگیر شاھی کا اقتباس کتاب کے آخر میں ضمیمہ نمبر ۱ میں ملاحظہ فرمائیں -

۲- محمد شاہ روشن اختر ذی قعد ۱۱۳۱ھ میں تخت نشین ھوئے اور ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی -

تھے - مخزن الغرائب اور دوسرے کئی تذکروں میں ان کے اشعار موجود ھیں ، دو شعر ملاحظہ فرمائیے -

محتسب ساز طرب را مشکن
درپس پردہ اش آواز کسی است
پرسرا سیمہ طپید است دلم دوش وداد
نالہ را نیز امید است اثری خواھد شد

مصحفی نے عقد ثریا میں اقرار کیا ھے کہ مرزا محمد رفیع سودا فارسی کلام میں وداد سے اصلاح لیتے تھے -

مظہر علی ولا ، محمد زمان وداد کے چھوٹے بیٹے تھے - مدت تک نواب نجف قلی خاں بہادر مظفر جنگ کی رفاقت میں رھے ، نجف قلی خاں ، ذوالفقارالدولا نجف خاں (متوفی ۲۲ اپریل ۱۷۸۲ء) کے ملازمین میں سے تھے -

نجف قلی خاں کے بعد ولا نے شہزادہ جواں بخت کی رفاقت اختیار کی - ۱۲۰۱ھ میں جب شہزادے نے بنارس کا سفر اختیار کیا ، ولا لکھنؤ ھی میں رھے اور ان کے ھمراہ نہ جا سکے - جواں بخت کی روانگی کے بعد ولا نے مشیرالملک ٹکیت رائے بہادر صلابت جنگ کے وسیلے سے آصف الاولہ کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ملازم ھو گئے -

۱۸۰۰ء میں گورنر جنرل ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کے لیے لکھنو سے ادیبوں اور شاعروں کو بلایا تو ولا نے بخشی الممالک فخرالدین احمد خاں عرف میرزا جعفر ابن محسن زمان خاں مرحوم کے توسط سے کرنل اسکاٹ صاحب تک رسائی حاصل کی اور ان کے اپنے بیان کے مطابق ۱۰ مارچ ۱۸۰۰ء کو چیف سیکرٹری کے ملازم ھو کر وارد کلکتہ ھوئے -

عتیق صدیقی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی کاروائیوں سے کرنل اسکاٹ کے ایک خط کے دو اقتباس دیے ہیں۔ چیف سیکرٹری کے نام اس خط کے مطابق ولا کو ۱۰ نومبر ۱۸۰۰ء کو ۸۰ روپے ماہوار تنخواہ پر کالج کے لیے ملازم رکھا گیا تھا۔ انھیں ۲۹۳ روپے پیشگی دیے گئے تھے جن سے ان کی فروری ۱۸۰۲ء تک کی تنخواہ ادا ہو جاتی تھی۔ عتیق صاحب کے نزدیک ولا اور کاظم علی جوان اکٹھے ملازم ہوئے تھے۔ جوان نے سکنتلا میں اپنی تقرری کی تفصیل لکھی ہے۔

کالج کونسل کی کاروائی مورخہ ۳۰ اگست ۱۸۰۲ء کے مطابق ولا ایک مرتبہ ملازمت سے بر طرف بھی ہوئے۔ اس فیصلے کے خلاف انھوں نے اپیل کی چنانچہ ۴ اکتوبر ۱۸۰۲ء کی کالج کونسل کی کاروائی میں ان کے دوبارہ تقرر کی منظوری ہو گئی[1]۔ کالج میں ولا کی حیثیت ہندوستانی شعبے کے ایک مترجم کی تھی۔

مظہر علی ولا، مترجم اور نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اکثر جگہ پر خود شاعر لکھا ہے۔ ہفت گلشن کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"مظہر علی خاں شاعر کہ ولا جس کا تخلص ہے ....."

اسی طرح بیتال پچیسی میں ان کے اپنے الفاظ ہیں:

"مظہر علی شاعر نے، جس کا تخلص ولا ہے ...."

۱۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد۔

مصحفی، شیفتہ، قدرت اللہ قاسم، نساخ اور بینی نرائن جہاں وغیرہ نے انھیں اچھے شاعروں میں شمار کیا ہے۔ ان کے اشعار کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ان کا اچھا خاصا تخلیقی ذہن تھا۔ کلام ولا کا جو انتخاب ڈاکٹر عبادت صاحب نے ہفت گلشن کے دیباچے میں دیا ہے وہ تو ایسا نہیں کہ اس سے شاعر کے بارے میں کوئی قطعی قسم کی رائے قائم کی جا سکے کیونکہ ان اشعار میں سوائے رعایت لفظی اور شاعرانہ تکلفات کے کوئی قابل توجہ بات نہیں ہے اور یہ شاعرانہ تکلف شاید اس زمانے کے اس رواج کی نمائندگی کرتا ہے جس میں ہر ادیب مؤرخ، داستان گو اور بہت کچھ اور بھی ہوتا تھا، وہاں شاعر بھی ہونا اس کی عظمت میں شامل تھا۔ البتہ بینی نرائن جہاں نے ولا کے کلام کا جو انتخاب اپنے تذکرے میں درج کیا ہے، وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

جلوے سے اس کے حسن کے عالم تھا بس کہ محو
دیکھا اس انجمن میں جسے وہ خموش تھا

کر دیا تختۂ دامن کو یہاں تختۂ باغ
کب رگ ابر سے کم ہے سرمژگاں میرا

جلوۂ حسن سے یہ کس کے ہے زیبا رخ صبح
کہ ہے آئینۂ دل سے بھی مصفا رخ صبح

پوچھے ہے ہم صفیر خبر کیا چمن کی تو
ہیں خار و خس تمام وہاں اب بجائے گل

نیرنگیٔ فلک سے جگر داغ ہوگیا
کیا کیا ملائے خاک میں افسوس ہائے گل
دل بستگی نہ رکھ چمن دھر سے ولا
آتی نہیں مشام میں بوئے وفائے گل

یاد میں اس کی کون سا دل جو مثل جرس نالاں نہیں
چشم نظارہ کس کی یہاں اب آئینہ ساں حیران نہیں
ایک نگہ اس ماہ جبیں کو دیکھا ہے جس نے اس کا تو
دیدۂ گریاں ، سینہ ہے بریاں ہوش نہیں اوسان نہیں
کاکل مشکیں رشک سنبل عارض گلگوں غیرت گل
قد کو نسبت سرو سے دوں پر اس میں تو یہ شان نہیں
دست نگاریں دیکھ کے ڈوبا پنجۂ مرجاں دریا میں
ساعد کی حرکات سے اس کے شاخ گل میں جان نہیں
چشم خماریں دیکھ اس گل کی باغ جہاں میں اے یارو
حیرت ہے رک عالم کو کچھ نرگس ہی حیران نہیں
کون سنے ہے کہنے حال دل اپنا عرض کرے
تیرے سوا تو کوئی ولا کا جان نہیں ، پہنچان نہیں

کثرت اشعار سے مشاعرہ برپا کرنا مقصود نہیں اور نہ ولا کی شاعری ہی پر سیرحاصل تبصرے کا یہ موقع ہے لیکن چلتے چلتے صرف اس قدر عرض کرنا ضرور مناسب ہے کہ انہوں نے اٹھارویں صدی کے نصف ثانی سے لے کر انیسویں صدی کے ربع اول تک تقریباً پون صدی کا زمانہ تو ضرور دیکھا تھا ۔ اور وہ یہ دور تھا ۔ جب پورے برصغیر میں ایک خاص قسم کی ذہنی اور

معاشرتی بدامنی رونما تھی ۔ اور اس کا سبب وہ شورشیں اور ہنگامے تھے جنہوں نے نہ صرف دلی ہی میں مغلیہ سلطنت کے شیرازے کو تہ و بالا کیا بلکہ پورے برصغیر میں ایک اضطراب اور خوف و ہراس کی لہر دوڑ دی تھی ۔ ولا کے کلام میں اس بربادی کا نوحہ بڑی بلند آواز میں سنائی دیتا ہے ۔

ولا کے بارے میں قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں :

"وے مرد حریف ، ظریف ، خوش طبع ، مزاح دوست واقع شدہ ۔"

بینی نرائن جہان نے اعتراف کیا ہے کہ وہ :

"ہمیشہ عمدہ روزگار رہے"

مزاج کی یہ شگفتگی اور عمدۂ روزگار ہونے کی یہ خوش مزاقی ولا کے کلام سے واضح ہے ۔ ان کے لہجے میں ایک خاص قسم کی ڈرامائی کیفیت اور ان کے بیان میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی پائی جاتی ہے ۔

ولا بقول شیفتہ ، ممنون کے شاگرد تھے اور سید محمد کے بیان کے مطابق انہوں نے ممنون کے علاوہ مرزا جان طپش اور غلام ہمدانی مصحفی سے بھی مشورہ سخن کیا تھا ۔ مصحفی خود اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں :

"استفادہ شعرش چندے بمرزا طپش و چندے بمولف بود ۔ حالا بہ میر نظام الدین ممنون کلام خود را می نماید ۔"

مظہر علی ولا کی مولفات میں مادھو نل اور کام کندلا ، ترجمہ کریما ، ہفت گلشن ، اتالیق ہندی ، تاریخ شیر شاہی ، جہانگیر شاہی اور زیر نظر کتاب بیتال پچیسی شامل ہیں ۔

ان کتابوں پر تفصیلی بحث سید محمد، حامد حسن قادری، محمد یحیٰی تنہا، گیان چند اور عتیق صدیقی کی کتابوں میں موجود ہے۔ بیتال پچیسی کا ایک مفصل تعارف آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا۔ ولا نثر کا ایک منفرد اسلوب رکھتے تھے اس پر تنقیدی محاکمہ بیتال پچیسی پر تفصیلی بحث کے ضمن میں آئے گا۔

شری للو جی لال کوی

شری للو لال کوی ہندی زبان کے مشہور عالم اور شاعر تھے سید محمد کے بقول ان کا خاندان پہلے گجرات میں آباد تھا جہاں سے ترک وطن کرکے ایک مدت سے شمالی ہند میں آ بسے تھے۔ ذات کے برہمن تھے اور چونکہ ان کا بچپن شمالی ہند میں گزار تھا، اس لیے ان کی برج بھاشا، سنسکرت اور دیگر پراکرتوں پر عالمانہ قدرت قرین قیاس ہے۔

۴ جنوری ۱۸۰۲ء کو گلکرسٹ نے چند مطالبات کالج کونسل کے سامنے بذریعہ خط پیش کیے تھے اس خط میں انہوں نے ہندوستانی اور بھاشا کے قریبی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک برج بھاشا منشی کے تقرر کا بھی مطالبہ کیا تھا۔ کالج کونسل نے ان کی درخواست پر عمل درآمد کرتے ہوئے شری للو لال کوی کو ۵۰ روپے ماہوار پر بھاکا منشی مقرر کیا۔ یہ کاروائی ۷ جولائی ۱۸۰۲ء کو عمل میں آئی۔[1]

۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو للو لال کی کتاب پریم ساگر پر ۲۰۰ روپے کا انعام کی سفارش کی گئی۔[2]

---

(۱)، (۲)، گل کرسٹ اور اس کا عہد مصنفہ عتیق صدیقی۔

گل کرسٹ کے جانشین کی تجویز کے مطابق ۱۱ جون ۱۸۰۴ء کو غیر ضروری قرار دے کر برطرف کر دیے گئے۔ دوبارہ مقرر ضرور ہوئے لیکن تقرری کی تاریخ کا پتا نہیں چلتا[1]۔

فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے دوران میں للو لال نے اگرچہ براہ راست اردو نثر کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دی، تاہم ان کی یہ خدمت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی کہ وہ کالج کے دوسرے منشیوں کو ہندی زبان کے ترجمے کرنے میں بڑی مدد دیتے رہے۔

للو لال کی تالیفات میں پریم ساگر، راج نیتی، سبھا بلاس، سبھا دیو بلاس، لطایف ہندی شامل ہیں۔ سنگھاسن بتیسی میں انہوں نے کاظم علی جوان اور بیتال پچیسی کے ترجمے میں انہوں نے مظہر علی ولا کی اعانت کی۔ بیتال پچیسی کے بارے میں گیان چند کا خیال ہے کہ اس کے اسلوب پر للو لال کوی چھا گئے ہیں۔ اس بیان میں کس حد تک صداقت ہے اس پر بحث آئندہ سطور میں ہوگی۔ للو لال کوی کی کتابوں کا تفصیلی تعارف گیان چند، سید محمد، حامد حسن قادری اور عتیق صدیقی کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

تارینی چرن متر

منشی تارینی چرن متر ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو فورٹ ولیم کالج کے مختلف شعبوں میں پنڈت اور منشیوں کی خدمات حاصل کی گئیں تو اس دن کی رپورٹ

---

(۱) گل کرسٹ اور اس کا عہد مصنفہ عتیق صدیقی

کے مطابق تارینی چرن متر نائب منشی مقرر ہوئے ۔ تنخواہ ایک سو روپے ماہوار تھی ۔ ان دنوں چیف منشی میر بہادر علی حسینی تھے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عہدے پر زیادہ دیر فائز نہیں رہے کیونکہ ۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء کی رپوٹ میں میر شیر علی افسوس کو ہیڈ منشی لکھا گیا ہے ۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء کو میر شیر علی افسوس نے انتقال کیا ۔ ان کے بعد کالج کمیٹی نے شری تارینی چرن متر کو دو سو روپے ماہوار تنخواہ پر ہیڈ منشی مقرر کیا ۔

تارینی چرن متر ہندوستانی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ منشی کے عہدے پر مئی ۱۸۳۰ء تک رہے ۔ اس کے بعد ۵۸ سال کی عمر میں ایک سو روپیہ پنشن پر سبکدوش ہوئے اور کلکتے سے مہاراجہ کاشی کے دربار میں چلے گئے ۔ راجہ رواکانت دیب کی کوشش سے انہیں وہاں ملازمت ملی ۔

۱۸ مئی ۱۸۳۴ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاشی کے کمشنر تھے اور راجہ ان کی کافی عزت کرتا تھا۔

تارینی چرن متر ذاتی تصنیف و تالیف کے علاوہ کالج کے دیگر مترجموں اور منشیوں کے کام کی نگرانی بھی کرتے تھے ۔ بیتال پچیسی کے مترجم کا اعتراف واضح کرتا ہے کہ نثر کے اچھے اسلوب کا ان کے پاس کس حد تک شعور موجود تھا ۔

متر کا ایک عظیم کارنامہ کلیات میر کی ترتیب ہے ۔ ان دنوں جب کہ آپ فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ہندوستانی کے ہیڈ منشی تھے ، میر تقی میر کا انتقال ہوا اور تارینی چرن متر نے میر کی وفات کے کچھ عرصے بعد کلیات میر کو مرتب کر دیا ۔ یہ کلیات ۱۸۱۱ء میں

کپتان جے ۔ ڈبلیو ۔ ٹیلر پروفیسر زبان ہندوستانی کی نگرانی میں شائع ہوا ۔ اس کے مدیر منشی تارینی چرن متر ، کاظم علی جوان ، اور غلام اکبر تھے ۔

گیان چند نے متر کی ایک تصنیف ''حکایات نصیحت آموز'' کا پتا بھی دیا ہے ۔ جو ۱۸۱۹ء میں شائع ہوئی ۔

تارینی چرن متر کا انتقال شاید ۱۸۳۷ء کے قریب کاشی ہی میں ہوا[1] ۔

کچھ بیتال پچیسی کے بارے میں

بیتال پچیسی کو مظہر علی ولا نے ۱۸۰۳ء میں اردو میں منتقل کیا ۔ اس کی موجودہ صورت اس کتاب کا ترجمہ ہے جسے بقول مترجم محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں صورت نام کیشور نے راجہ جے سنگھ سوائی والی جے نگر کی فرمایش پر سنسکرت سے برج بھاشا میں منتقل کیا ۔ اس کتاب میں پچیس کہانیاں ہیں جن کا شجرہ سنسکرت کی قدیم کلاسیکی کتابوں کتھا سرت ساگر اور برہت کتھا منجری سے ملتا ہے ۔ یہ کتابیں سنسکرت کلاسیک میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں ۔ ان کہانیوں کے علاوہ کتھا سرت ساگر میں بے شمار قصے اور داستانیں اور بھی ہیں[2] ، لیکن ان پچیس کہانیوں کو شاید اس لیے الگ کتابی صورت دے دی گئی کہ یہ تمام ایک خاص رشتے سے منسلک ہیں اور وہ یہ کہ ان سب کو بیان کرنے والا ایک ہی کردار یعنی بیتال ہے ۔

---

۱ ۔ متر کے مندرجہ بالا حالات بھٹہ چاریہ کی کتاب ''بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات'' سے ماخوذ ہیں ۔

۲ ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۲ (الف)

کتھا سرت ساگر کی تالیف کا زمانہ متعین نہیں لیکن مہاراجہ بکرما جیت کا عہد جس سے یہ کہانیاں متعلق ہیں، ۳۷۵ء سے ۴۱۳ء تک بیان کیا جاتا ہے ۔ اس زمانے سے محمد شاہ کے عہد حکومت اور پھر اس سے فورٹ ولیم کالج تک کا زمانہ ان کہانیوں کو اپنے اصل سے کم و بیش پونے چودہ سو سال کا سفر طے کر کے ہم تک پہنچاتا ہے ۔ اس طویل مدت میں ان کہانیوں کا جزئی طور پر اپنے اصل سے خاصا دور ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا لیکن آج بھی جب ہم سنسکرت سے براہ راست ترجمہ شدہ کہانیوں اور برج بھاشا کے راستے آنے والی کہانیوں کو آمنے سامنے رکھ کر پڑھتے ہیں تو ہمیں بہت کم اختلافات نظر آتے ہیں ۔ جو معلوم نہیں سنسکرت سے برج بھاشا میں منتقل ہوتے وقت رونما ہوئے یا برج سے اردو میں آتے وقت پیدا ہوئے ۔ کیونکہ ہمارے سامنے برج بھاشا کی مثالیں موجود نہیں ۔

سنسکرت اور اردو کہانیوں میں اختلافات کے نمونے پیش کرنے کے لیے مظہر علی ولا اور Buitenen کی کتاب Tales of Ancient India کا حوالہ دیا جا سکتا ہے ۔ جس کی تفصیل حرف آغاز میں پیش کی جا چکی ہے ۔ اس کتاب میں بیتال پچیسی کی گیارہ کہانیاں سنسکرت سے براہ راست انگریزی میں ترجمہ ہوئی ہیں ۔ پہلا اختلاف تمہید میں ہے ، ولا کے ہاں جوگی ہر روز پھل لاتا ہے اور راجہ بھنڈاری کو دے دیتا ہے ۔ ایک روز جوگی اس موقعے پر حاضر ہوتا ہے جبکہ راجہ کسی کام سے اصطبل میں گیا ہوتا ہے ۔ جوگی اس جگہ راجہ کو لعل پیش کرتا

ہے ۔ اتفاقاً وہ لعل راجہ کے ہاتھ سے گر جاتا ہے اور اسے اصطبل کا ایک بندر اٹھا کر توڑ دیتا ہے اور اس طرح اس میں سے ایک بیش بہا رتن برآمد ہوتا ہے ۔ Buitenen کے نزدیک یہ واقع اصطبل کی بجائے راجہ کے محل ہی میں پیش آتا ہے اور پھل کو اصطبل کے بندر کی بجائے گھر کا پالتو بندر توڑتا ہے ۔

دوسرا اختلاف اس کہانی میں ہے جس میں دھوبی کی لڑکی دو آدمیوں کے سروں کو گھبراہٹ میں تبدیل کر کے ان کے جسموں پر لگا دیتی ہے ۔ ولا کے ہاں ان دو آدمیوں میں سے ایک دھوبن کا خاوند اور دوسرا اس کے خاوند کا دوست ہے لیکن Buitenen کی کتاب اور بقول گیان چند کتھاسرت ساگر[1] میں دھوبن کے خاوند کے ہمراہ اس کا دوست نہیں بلکہ دھوبن کا بھائی ہے جو اسے میکے سے لینے آتا ہے ۔ اختلافی مقامات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کی وہ صورتیں جو سنسکرت الاصل ہیں اور Buitenen کے ہاں پائی جاتی ہیں زیادہ قرین صحت ہیں ۔

ان دونوں مقامات کے علاوہ کتاب کے آخر میں جہاں راجا بکرماجیت بیتال کی لاش کو لا کر جوگی کے حوالے کرتا اور پھر کمال دانش مندی سے جوگی کو ہلاک کر دیتا ہے ۔ تب تمام دیوی دیوتا جے جے کار کرتے ہوئے معہ اندر کے آتے ہیں ۔ اس جگہ Buitenen نے ایک تلوار کا ذکر کیا ہے جو راجا اندر راجا بکرماجیت کو اس کی

---

(۱) دیکھیے ضمیمہ نمبر ۲

بہادری پر خوش ہو کر بطور انعام دیتا ہے لیکن مظہرعلی ولا کے ہاں اس تلوار کا کوئی نشان نہیں ملتا ۔

اختلافات کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید ولا اور للو لال کوی دونوں کی نظر سے بیتال پچیسی کا صرف برج بھاشاہ والا نسخہ گزرا ہو اور اصل سنسکرت نسخے تک ان کی رسائی نہ ہوئی ۔ یہی صورت سکنتلا کے ترجمے کے سلسلے میں کاظم علی جوان کے ساتھ بھی پیش آئی تھی لیکن انھوں نے اس حقیقت کا اعتراف واضح الفاظ میں کر لیا تھا ۔ چنانچہ سکنتلا کے آغاز داستان میں ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

''اس کبیشر نے یہ کہانی کبت دوہرے میں کہی کہ جس کا ترجمہ یہ ہے ۔ اور جو انگریزی میں ہے وہ اصل سنسکرت سے ہوا ہے ۔ اگر اس میں اور اس میں کچھ فرق ہو تو ممکن ہے ۔''

جوان کو سکنتلا ، اصل کتاب کے انگریزی ترجمے کا علم ہے لیکن مظہر علی ولا بیتال کے اصل سنسکرت سے نا واقف ہیں ۔

○ ○ ○

زیر نظر کتاب مظہر علی ولا نے مارکوئس ولزلی کے عہد یعنی ۱۸۰۳ء میں جان گلکرسٹ کی فرمائش پر فورٹ ولیم کالج کے لیے ترجمہ کی ۔ تاریخی چرن متر کے مرتب کیے ہوئے ولیم پرائس کے دیباچے اور بارکر مرتبہ نسخے کے پیش لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فورٹ ولیم کالج میں زیر تعلیم ملٹری آفیسروں کے کورس میں شامل تھی ۔ ولیم پرائس نے اسے ملٹری کے جونیر آفیسروں تک محدود رکھا ہے ، الفاظ ہیں :

The following selection have been made to facilitate, cheifly to the junior members of the military service the acquisition of the prevailing language of hindoostan.

لیکن بارکر والے نسخے میں پوری فوج کے لیے تجویز کیا گیا ہے ۔ کتاب کے آخر میں ایک اشتہار بھی ہے جس میں بیتال پچیسی کو معاصر کتابوں میں سب سے بلند مقام دیا گیا ہے ۔ مرتب کا خیال ہے کہ اردو زبان سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے صرف اس ایک کتاب کو پڑھ لینا ہی کافی ہے ۔

مورخہ ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو گلکرسٹ نے کالج کونسل کو جن کتابوں کے زیر طبع ہونے کی اطلاع دی تھی ان میں بیتال پچیسی بھی شامل تھی ۔ یہ کتاب اس وقت دیو ناگری رسم الخط میں بڑے چوتھائی ۳۲۴ صفحات پر چھپ رہی تھی اور اس کے اخراجات کا تخمینہ ۸۵۰۰ روپے تھا ۔ چھپائی کا کام ابھی شروع نہیں ہوا تھا ۔[1]

۱۹ اگست ۱۸۰۳ء میں بیتال پچیسی پر ۲۰۰ روپے انعام دینے کے لیے کالج کونسل سے سفارش کی گئی ۔ یہ تجویز سب سے پہلے ۲ نومبر ۱۸۰۱ء کو پیش ہوئی تھی ۔ سفارش میں بیتال پچیسی کے علاوہ مظہر علی ولا کی دو اور تصانیف مادھونل اور ہفت گلشن پر بھی بالترتیب ۹۰ روپے اور ۸۰ روپے کے انعامات دینے کے لیے کہا گیا تھا ۔[2]

○ ○ ○

بیتال پچیسی کی تمام کہانیاں ایک بنیادی وحدت سے

۱- ۲- گل کرسٹ اور اس کا عہد

همکنار ہیں ۔ جو بادشاہ اور لاش (یعنی بیتال) کے حوالے سے ابھرتی ہے ۔ اور یہی وحدت کتاب کی مرکزی کہانی کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے ۔ مشہور ماہر ہندوستانیات ہائنرخ سمر[1] نے اپنے ایک مضمون ''بادشاہ اور لاش،، میں ان کہانیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں بیان کی گئی فینتسی (Fantasy) انسانی زندگی کے جسمانی اور روحانی سفر سے عبارت ہے ۔ راجہ کا جوگی سے تحایف قبول کرکے ایک بھاری ذمے داری اٹھا لینا نہ صرف اس کی خود اعتمادی کا امتحان ہے ، بلکہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس کا اپنی جان کی بازی لگا دینا بھی ممکن ہے ۔

جوگی کے دیے ہوئے پھل ہماری زندگی کے ان لاشعوری محرکات کی علامتیں ہیں جو حقائق کی معرفت حاصل کرنے کی ہمیں بار بار دعوت دیتے رہتے ہیں ۔ اور جن سے ہم شعوری سطح پر غافل رہتے ہیں ۔ ہم میں سے ہر شخص اسی قسم کا ایک بیش قیمت پھل ہے جو اپنی روزمرہ زندگی کے غلاف میں چھپا ہوا ہے ۔ اور جس طرح راجا ان پھلوں کو ایک عرصے تک قابل اعتناء نہیں سمجھتا اسی طرح ہمارا شعور بھی اپنے وجود کے قیمتی ثمر کو بے اعتنائی سے قبول کرتا ہے ۔ اور ہم اپنی ''انا،، کو برسر عمل دیکھتے ہوئے بھی اس کے اعمال پر غور نہیں کرتے ۔ یہ ''انا،، کبھی

---

۱ ۔ ہائنرخ سمر ۱۸۹۰ء میں بحر بالٹک کے کنارے گریفس والڈنامہ قصبے میں پیدا ہوئے ۔ ۱۹۴۳ء میں ان کا انتقال ہوا ۔ مضمون کا ترجمہ محمد سلیم الرحمن صاحب نے کیا ہے ۔ ارادہ تھا کہ اسے کتاب کے ساتھ شامل کر لیا جائے لیکن بعض وجوہ کی بناء پر ایسا نہ ہوسکا ۔ (گوہر نوشاہی)

راجا کے خزانچی کی طرح ہمارے اندر چھپے ہوئے جوہر قابل کی حفاظت کرتی ہے اور کبھی راجا کے بندر کی مثال بعض ایسی حقیقتوں کو جن سے ہمارا شعور آگاہ نہیں ہوتا ، ہمارے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے ۔

راجہ اور لاش کا رشتہ ، انسان کا اپنی ذات کی ان لاشعوری قوتوں کا رشتہ ہے جو اس وقت تک بے حس اور مردہ ہوتی ہیں جب تک کہ وہ انہیں خود تحریک نہیں دیتا اور انہیں پورے طور پر نہیں اپناتا ۔

راجہ کے گرد پھیلی ہوئی سیاہ رات ، بھوت پریت کا ہجوم اور راجہ کی اکیلی ذات اس شخص سے مماثل ہے جو زندگی کے سفر میں اکیلا ہے اور اسے روح کی بھول بھلیوں سے گزرنے کے لیے کسی قدوسی رہنمائی کی ضرورت ہے ۔

بیتال کا مردہ جسم یعنی مرگھٹ کے درخت کا ایک پھل اپنے اندر عجیب و غریب فطرت رکھتا ہے ۔ ہم میں سے ہر شخص کے کاندھے ایسی ہی لاش کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں جو اپنے اندر ماضی کے بے شمار خواب اور ان سے وابستہ یادیں رکھتی ہے ۔ بیتال کا یہ مردہ جسم ہماری انا کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے اور اس کے اندر چھپا ہوا بیتال ہمیں اپنی رعب دار آواز میں ہر وقت دھمکی دیتا رہتا ہے کہ اگر ہم نے اس کی الٹی سیدھی باتیں ماننے سے انکار کیا تو ہلاک ہو جائیں گے ۔

یہ کہانیاں جو دل کش ، فال آور اور درد ناک ہیں ، ہماری کمر پر لدے ہوئے بیتال کی زبان انہیں بیان کرتی جاتی ہے اور ہر کہانی کے خاتمے پر للکار ہے کہ زندگی نے یہاں جو پہیلی تم سے پوچھی ہے ، اسے بوجھو ۔

اس اوپرے خول کو توڑ دو جس نے حقائق کے ان جگمگاتے ہوئے ہیروں کو چھپا رکھا ہے ۔ ان کہانیوں میں جتنے کردار ، جتنے ہیرو ، ہیروئنیں اور شیطان صفت لوگ ہیں ، ہم خود ہی ہیں اور ہم خود ہی کسی نہ کسی طرح ان پہیلیوں کا حل ہیں ۔ یہ لاش ہمارے اپنے بھولے بسرے ماضی کی شیرازہ بندی ہے ۔ یہ تکمیل سے محروم ، غیر مطمئن لاش لازماً ہمارے سر پر سوار رہے گی جب تک کہ ہم اپنے وجود کے اس پہلو کو قبول نہ کر لیں جسے اب تک تسلیم نہ کیا تھا ۔

ہماری آگہی کا راستہ آزمائشوں کے جہنم اور غفلتوں کے مرگھٹ سے گزرتا ہوا ہمیں اس منزل پر پہنچا دیتا ہے جہاں ہم اس بلند تر حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں جو ہم میں ہمیشہ سے موجود تھی اور تکمیل کے لیے بیتاب تھی ۔ لیکن ہماری شخصیتوں اور ان پوشیدہ قوتوں کے درمیان ریاکار سادھو اور لاش میں چھپا ہوا بیتال راستہ روکے کھڑے ہیں اور ہمیں ان کو پورے طور پر مطمئن کرنا ہے ۔

لاش میں چھپا ہوا بیتال ہمارے اندر کی وہ قوت ہے جسے ہر چیز کا علم ہے ۔ یہ قوت ہمیں اس آفت سے بچاتی ہے جس کی طرف ہم اندھا دھند بڑھے جا رہے ہیں ۔ یہ ہماری اپنی انا سے زیادہ علیم و دانا ہے ۔ یہ اس راجا سے جو ہم بننا چاہتے ہیں زیادہ باہمت اور قوی ہے ۔

راجا اور بیتال کے درمیان ایک خاص تعلق قائم ہو جاتا ہے ۔ اس ہولناک سفر کے دوران میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں ۔ جس کا سبب وہ مشترک خوف ہے جو قضا کی صورت میں ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے اور

اسی یگانگت کے تحت وہ ایک دوسرے کی جان بچاتے ہیں ۔ مہا جسمانی راجا اور بے جسم کا بیتال ، غیر مرئی اقالیم ، روز روشن کی شاہانہ "میں" ، رات کی تاریکی اور آسیبی آوازیں آپس میں لازم و ملزوم ہیں اور باہم دگر ایک واحد زندہ اکائی بناتی ہیں ۔ ان کی سرگرمیوں کو زمانی مطابقت نے اور بھی اہم بنا دیا ہے ۔ بیتال ، راجہ کو اس اجل سے بچا لیتا ہے جو اسے گلے سڑے ماضی کی طرف لے جا رہی تھی ۔ چنانچہ آخر میں وہی بیتال جو بجائے خود لاش یا بھوت ہے ، قابل نفرت معلوم نہیں ہوتا ۔

راجہ بیتال کے چیستان کا جواب کامیابی سے دیتا ہے ۔ اور بیتال اس کو اپنا دوست بنا لیتا ہے ۔ راجہ بیتال کی سنائی ہوئی کہانیوں کے ذریعے اپنی زندگی میں ان چیزوں کو سمو لیتا ہے جنھیں اب تک وہ نظر انداز کرتا رہا ہے ۔

یہ پچیس کہانیاں اردو کے داستانی ادب میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں اور تکنیک کے اعتبار سے داستانوں کی نسبت افسانوں کے زیادہ قریب ہیں ۔ جو کردار اور واقعات روشناس کرائے گئے ہیں وہ دوسری داستانوں کی طرح مافوق الفطرت نہیں ۔ بلکہ عام انسانی معاشرے کے جیتے جاگتے افراد ہیں ۔ بیتال کو بکرماجیت نے ایک بھوت سمجھ کر نہیں بلکہ اس لاشعوری انس اور تعلق کے تحت اٹھا رکھا ہے جس میں اس بات کا احساس شامل ہے کہ وہ دونوں ایک ہی شبھ لگن مہورت میں پیدا ہوئے تھے ۔ بیتال کی راجہ بکرماجیت سے جن موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہے ان کا تعلق عام انسانوں کی روزمرہ نفسیات سے ہے ۔

یہ ان راجاؤں کی کہانیاں ہیں جو رشیوں کے بچار

سنتے ، برھمنوں کی عزت کرتے ، ان کے سراپ سے ڈرتے اور روح کی جسم پر فتح کو مسلم سمجھتے ھیں ۔ ایک راجہ کو جب اس کا سپہ سالار اپنی بیوی پیش کرتا ھے تو وہ آگ بگولا ھو کر کہتا ھے :

''کیا میں ادھرمی ھوں جو ادھرم کروں؟ برانی (پرائی) ستری ماتا کی سمان ھے اور برانا (پرایا) دھن ماٹی برابر۔''

یہ ان رشیوں کے قصے ھیں جو خیر اور شر کی تعلیم کے لیے اپنا ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ھیں ۔ وہ نقطۂ نظر جس کی جڑیں ھندو دیو مالا کے عقاید میں پیوست ھیں ۔ یہ رشی دھرم اور ادھرم کا فرق بیان کرتے ھیں ۔ عورت کا پتی کے لیے اور سیوک کا سوامی کے لیے ستی ھو جانا ان کے نزدیک دھرم ھے اور پانی اور اناج کھا کر زندگی بسر کرنے والے جانداروں کو مارنا ادھرم ھے۔

دھرم اور ادھرم کا یہ کھیل ھندو مذھب و معاشرت سے گہرا تعلق رکھتا ھے ۔ ھندو مذھب میں جسم اور روح کا تعلق اور ایک جسم کا دوسرے جسم سے رشتہ اپنے اندر بعض منفرد خاصتیں رکھتا ھے ۔ یہی وہ موڑ ھے جہاں سے نر اور ناری کا رشتہ اس معاشرت میں داخل ھوتا ھے ۔ گویا اس طرح مذھب اور گرھستھ آشرم ایک ھی حقیقت کے دو رخ بن جاتے ھیں اور آپس میں اس قدر لازم و ملزوم ھو جاتے ھیں کہ ایک کا دوسرے کے بغیر تصور ناممکن ھو جاتا ھے ۔

یہ کہانیاں پند و نصائح ، اخلاقی اور حکیمانہ نکات سے لبریز ھیں اور ان میں مشاھدے اور تجربے ، علم و ھنر اور حکمت و دانش کے زیر سایہ پرورش پاتے ھوئے دکھائی

دیتے ھیں ۔ بیتال پچیسی سے چند اقتباس اس جگہ بے موقع نہ ھوں گے :

''راجہ نے کہا اے پتر ! یہ شریر انتیہ ھے اور دھن بھی استھر ھے ۔ جب آدمی جنما ، تر مرتیو بھی اس کے ساتھ ھے ۔ اس سے اب راج کاج چھوڑ ، دھرم کاج کیا چاھئے ۔''

''سیوک کا دھرم یہ ھے کہ سوامی کے پیچھے اپنا جی دے ۔''

''ستی ھونے کے سمان ناری کو کوئی دھرم نہیں ۔''

''جب پریتی کے بس آدمی ھوتا ھے تب اسے دھرم ، جات اور کھانے پینے کا کچھ بچار نہیں رھتا ۔''

''اے پتر ! ایسے کہا ھے ، جو پتی برتا ستری کو چھوڑ کے جدا رھتا ھے اور ناری کو پیٹھ دیتا ھے ، یا جو جسے چاھے وہ اسے نہیں چاھتا وہ چنڈال کے سمان ھوتا ھے ۔''

''جن کو حسین عورت میسر نہ ھو ، ان سے سنسار میں پشو بھلے ھیں ۔ دھرم کا پھل ھے دھن اور دھن کا پھل ھے سکھ اور سکھ کا پھل ھے ناری اور جہاں ناری نہیں ، تہاں سکھ کہاں ؟''

''گویل کا سر ھی روپ ھے اور ناری کا روپ پتی برت ۔''

''مہاراج ! پرش پاپی ادھرمی ھوتے ھیں ۔''

''مہاراج رنڈی اپنے دوست کو پسند نہیں کرتی ۔''

''برانے ارتھ جن کا جیو ھے انھوں کا جینا سپھل ھے ۔''

"جو لوگ کہ برانا دکھ نہیں سمجھتے اور غیروں کے جی مار مار کھاتے ہیں ، ان کی اس پرتھوی میں عمر کم ہوتی ہے اور لولے ، لنگڑے ، کانے ، اندھے ، بونے ، کبڑے ایسے انگ ہیں ہو ہو جنم لیتے ہیں ۔"

ان اقتباسات کے ذریعے ہم اس معاشرت میں قدم رکھتے ہیں جہاں زندگی بسر کرنے کا ایک واضح نصب العین موجود ہے ۔ وہ نصب العین جس میں نیکوکار اور گنہگار اپنے افعال کی جزا اور سزا ایک ایسی عدالت سے حاصل کرتے ہیں جس کا وجود محض قانون کے اندر ہی نہیں بلکہ اس معاشرے میں رہنے والے ہر فرد کے ضمیر میں بھی موجود ہے ۔

ایک ہی کردار کی زبان سے ادا ہونے والی یہ کہانیاں بیان کی وحدت سے ہم آہنگ ہیں ۔ وقت کا احساس کہ ایک ہی رات میں راجہ کا بیتال کو کاندھے پر اٹھا کر یہ سفر طے کرنا اور بیتال کا راجہ کی آواز سن کر بار بار واپس درخت پر جانا اور راجہ کو پھر اسے جا کر اتارنا ہے ، ان کہانیوں کے اسلوب کو اور بھی گھمبیر اور پرپیچ بنا دیتا ہے ۔ بیتال چاہتا ہے کہ کہانی سنانے میں جس قدر تاخیر ہو جائے اچھی ہے کیونکہ اس طرح راجہ اپنے مقصد میں ناکام ہوگا ۔ لیکن راجہ بھی بڑا ہوشیار ہے وہ بڑی عقلمندی سے ہر کہانی کا ایک مختصر سا حل تلاش کرکے بیتال کو مطمئن کر لیتا ہے ۔ بیتال کا کہانی بیان کرنے کا انداز ایک داستان گو اور شاعر کا سا ہے لیکن بیتال اپنے جواب میں اچھا خاصا قطعیت پسند اور سائنٹفک ہے ۔

احساس وقت کے اس فریم نے ان کہانیوں میں جہاں جذباتی اختصاریت ، اور بچت توجہ ایسی خصوصیات پیدا کی ہیں ، وہاں کہانیوں کو ایک بھرپور قسم کا ڈرامائی لہجہ بھی دیا ہے ۔ مظہر علی ولا کا کمال ہے کہ پوری کتاب میں کسی جگہ بھی ان کے مزاج کا یہ رنگ بدلتے نہیں پایا ۔ ان کے ہاں لفظ کم اور Gesturs زیادہ ہیں ۔ وہ جذباتی مواقع (Emetional Situations) پیدا کرنے کے معاملے میں مشاق اور واقعات کی جزئیات میں ایک خاص قسم کا چناؤ کرنے میں ماہر ہیں ۔ ایک سراپا ملاحظہ فرمایئے :

"حسن ایسا گویا اندھیرے گھر کا اجالا ، آنکھیں مرگ کی سی ، چوٹی ناگن سی ، بھویں کمان سی ، ناک تیر کی سی ، بتیسی موتی کی سی لڑی ، ہونٹ کندوری کی مانند ، گلا کپوت کا سا ، کمر چیتے کی سی ، ہاتھ پاؤں کومل کمل سے ، چندر مکھی ، چمپا برنی ، ہنس گونی ، کوکل بینی جس کے روپ کو دیکھ اندر کی اپسرا بھی لجائے ۔"

اس سراپا میں استعمال ہونے والی تشبیہات سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے کے انسان کا عورت کے بارے میں کس درجہ صحت مند اور جاندار تصور تھا ۔ ترجمہ کرتے وقت ولا کا لفظوں کا چناؤ قابل تحسین ہے ۔

○ ○ ○

گیان چند نے بیتال پچیسی کے اسلوب پر للو لال جی کوی کا ہندی نواز ذہن غالب قرار دیا ہے ۔ مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے ۔ اس لیے کہ بیتال پچیسی کی کہانیوں کے موضوع کا تقاضا تھا کہ اس کے لیے ایسا اسلوب اختیار کیا جائے جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کم اور ہندی

اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ ہوں ۔ ان کہانیوں کی فضا ہندوستانی معاشرت کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے جسے ہم صحیح معنوں میں سنسکرت عہد کہہ سکتے ہیں ۔ اس عہد کے لہجے یا اظہار کے پیمانے ولا کے عہد سے مختلف تھے، پس ان لہجوں کو محفوظ کرنے اور ان سے متعلق کرداروں کی زندہ تصویریں پیش کرنے کے لیے لازم تھا کہ ایک ایسا Diction اختیار کیا جائے جو اس عہد کی بھرپور تصویر ہمارے سامنے پیش کرے اور ظاہر ہے کہ ایسا Diction ہندی اور سنسکرت الفاظ کے بکثرت استعمال کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا تھا ۔ اس کے علاوہ شاستروں کی تعلیمات جو بیتال پچیسی کی ہر کہانی کا ایک اہم جزء ہیں ہندی اور سنسکرت الفاظ کے بغیر کسی زبان کے الفاظ میں پیش نہیں کی جا سکتی تھیں ۔

ان حقائق کے پیش نظر بیتال پچیسی یا سکنتلا کے اسلوب کا مقابلہ باغ و بہار یا ہفت گلشن کے اسلوب سے کرنا میرے نزدیک قرین انصاف نہیں ۔ کیونکہ پہلی دو کتابیں ہندی تہذیب و معاشرت کی نمائندگی کرتی ہیں اور دوسری دو کتابیں عجمی طرز حیات سے ملتی جلتی ہیں ۔ اور ہر تہذیب و معاشرت اپنی ایک مخصوص زبان اور مخصوص طریق اظہار (Way of Expresion) رکھتی ہے لہذا سنسکرت تہذیب کی نمائندہ تصویر کو عجمی تہذیب کے فریم میں جڑ کر اس کی قدروں پر محاکمہ کرنا کسی طرح سے بھی مستحسن نہیں ۔

دیکھنا یہ ہے کہ مظہرعلی ولا نے سنسکرت اور ہندی الفاظ کو استعمال کرکے اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی

حاصل کی ہے ۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

''اے چندر ماں ہم سنتے تھے کہ تم میں امرت ہے اور کرنوں کی راہ تم امرت برساتے ہو، سو آج میرے پر تم ترکش برسانے لگے ۔''

''اس کا مکھ چندر ماں سا، بال گھٹا سے، آنکھیں مرگ سی ۔''

''جو سب پر دیا کرتا ہے، وہی گیانی ہوتا ہے''

''جوانی اس کی دن بدن بڑھتی تھی اور روپ اس کا پل پل ادھک ہوتا تھا ۔''

پروفیسر وقار عظیم اس بات کے معترف ہیں کہ یہ الفاظ ''اپنی ساخت اور آواز کے اعتبار سے سبک اور ہلکے پھلکے ہیں'' اور ان کے نزدیک ان کہانیوں میں ''دل نشینی اور تاثیر اس لیے ہے کہ ان کہانیوں کا پس منظر خالص ہندوستانی ہے ۔'' ترجمے کی یہ خوبیاں صرف مظہرعلی ولا کے حصے میں ہی نہیں آئیں بلکہ فورٹ ولیم کالج کی قریباً ہر کتاب ان صفات سے متصف ہے اور میرے نزدیک تو فورٹ ولیم کی کتابیں اردو ادب کے صحیفے ہیں اور بیتال پچیسی ان میں سے ایک ہے ۔

گوہر نوشاہی